اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۹، شمارہ ۲، مسلسل شمارہ: ۳۷۲، سال ۲۰۲۴ء

معاصر اُردو نظم کے استعارات پر نئے عالمی نظام کے اثرات

فائزہ افتخار

لیکچرار اُردو

گورنمنٹ گریجوایٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

INFLUENCE OF NEW WORLD ORDER ON THE METAPHORIC SYSTEM OF CONTEMPORARY URDU POEM

Faiza Iftekhar
Lecturer in Urdu
Govt. Graduate College Satellite Town, Rawalpindi

Abstract

Urdu poem has always been in sync with the affairs and issues of its time.Contemporary poem is not only distinguishable from the poem of the 20th century through its intellectual and cultural foundations, but also through its stylistical choices, that is, its language, symbolism, and tropes, it has carved for itself a distinct identity. Ergo, understanding the figurative and metaphorical system of contemporary Urdu poem is indispensable. For this purpose, the subjects explored in Urdu poetry as a result of the new world order, including terrorism, cultural identity, clash of civilizations, consumer culture, global politics, global economic system, and the resulting threats; globalization, the effects of social media, cyberwarfare, the relentless use of mechanical and scientific technology, and uncertainty and absurdity of life have had profound influence on the architecture of poetic metaphors which demands scholastic scrutiny.

Keywords:
Contemporary Urdu Poem, Metaphoric System, New World Order, Cultural Identity, Globalization

اردو نظم قابل قدر صنفِ سخن ہے اور شاعری میں ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ اس میں با آسانی ایسے افکار تلاش کیے جاسکتے ہیں جو اسے آرٹ کے درجے تک پہنچاتے ہیں اور معاصر عہد میں غزل کی نسبت زیادہ مقبول ہے جس کی وجہ نہ صرف خارجی مظاہر کا موثر بیان ہے بل کہ افرد کے داخلی معاملات اور آشوب ذات کے بیان کے لیے بھی موزوں ترین سمجھی جاتی ہے۔

نظم کی قرات کے بعد جو مرحلہ درپیش ہوتا ہے وہ اس کی تفہیم و تجزیہ ہے جس میں دو عناصر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ایک فکر اور دوسرا فن۔ فکر میں جہاں موضوعات کو مختلف تحریکوں، نظریات نیز انسان کی انفرادی و اجتماعی نفسیات سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے وہیں فن کی تشکیل میں کئی ایسے عناصر ہیں جو نظم کو سطحیت سے بچانے کے لیے بالواسطہ ذرائع اظہار کے طور پر استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اظہار کا بالواسطہ پیرایہ یعنی ایک بات کہنا اور دوسری بات مراد لینا شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں جن میں سے ایک استعارہ ہے۔ شاعری کی زبان کا امتیازی وصف استعارہ ہے۔ استعارہ کلام میں حسن ہی نہیں پیدا نہیں کرتا بل کہ اس کے بغیر شاعری کا تصور محال ہے سیدہ جعفر ایک جگہ لکھتی ہیں:

> "شاعری میں استعارے کی معنویت سے مراد یہ ہے کہ شاعر نے کس مماثلت اور مشابہت کی بنا پر اس کا انتخاب کر کے اسے مرکزی اہمیت عطا کی ہے۔ نظم نگار شاعر کے کلام میں استعاراتی نظام اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں نظم کا بنیادی تاثر سمٹ آتا ہے اور اس کا تجزیہ شاعری کے تخلیقی سرچشموں اور تخلیقی جہات کی بازیافت میں مدد دیتا ہے۔"(۱)

اردو نظم کا موجودہ منظرنامہ اپنے موضوعات اور اور اظہار ہر دو صورت میں گزشتہ نظم سے مختلف ہے۔ کلاسیکی استعاروں کی جگہ اب جدید استعاروں نے لے لی ہے اور اس طرح اردو زبان کا دامن نئے شعری وسائل سے مالا مال ہوا ہے اور اس میں ایک خاص طرح کی جدت بھی آئی ہے۔ معاصر نظم کے موضوعات، معاشرتی مسائل اور اندازِ بیاں بھی جدید دور کی ترقی کے استعاروں سے تشکیل پاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عہد حاضر اس وقت کن معاملات و مسائل کے ساتھ نبرد آزما ہے؟ ڈاکٹر ناصر عباس نیر (۱۹۶۵ء) ایک مضمون "معاصر عہد کی ترجمان نظم" میں لکھتے ہیں کہ ہم اب حقیقی نہیں بل کہ تشکیلی دنیا کے فرد ہیں۔ اس دنیا نے فرد اور سماج کے تعلقات، اظہار و ابلاغ، زمان و مکان یہاں تک کہ عشق اور انسانی وجود کو ہمیشہ سے درپیش ازلی سوالات کا سلسلہ بھی تہہ وبالا کر دیا ہے۔

یہ دنیا دن بہ دن مبہم ہوتی جا رہی ہے جہاں کچھ بھی واضح نہیں ہے۔ مذہبی نظریات، تصورِ خدا، حکومتی معاملات، جھوٹ، سچ کسی کی بھی کچھ متعین شناخت نہیں ہے کیوں کہ یہ دنیا نیو ورلڈ آرڈر یعنی نئے عالمی نظام کے تابع ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر ایک ان دیکھی مطلق العنان طاقت کے ذریعے عالمی حکومت کا نفاذ ہے۔ ایسی اشرافیہ جو عظیم سیاسی اور معاشی طاقت کی مالک ہے اور ایک عالمی حکومت کو نافذ کرنے کی سازش کر رہی ہے۔ اس کا ایجنڈا بالآخر دنیا پر تسلط حاصل کر لینا ہے یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں ہونے والے بڑے واقعات وسانحات کے پیچھے اسی طاقت کا ہاتھ ہے جس کے بعد صورت حالات یک سر تبدیل ہونے لگتی ہے۔ محض ابتدائی بیس سالوں میں دنیا کو دو بڑے دھچکے ایسے لگ چکے ہیں کہ پہلے واقعے کے بعد کی دنیا کو مابعد نائن الیون اور دوسرے کے بعد مابعد کرونوی عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو اب تک محض دو دہائیوں میں ہی دنیا تیزی سے تبدیل ہوئی ہے۔ لہٰذا اس عرصے میں تخلیق ہونے والے ادب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح اس صدی کی پہلی دہائی کے معاملات و مسائل مختلف نوعیت کے تھے تو تخلیقی موضوعات بھی اسی سے متعلق تھے بالکل اس طرح دوسری دہائی اپنے ساتھ اور طرح کے مسائل لے کر آئی جس سے زندگی کا دھارا تبدیل ہو گیا ہے:

تاریخ تھک کر ٹھہر گئی ہے / اور دنیا / نیو ورلڈ آرڈر کے تابع ہو چکی ہے
نجات کے لیے / ہمیں پھر سے ایک طویل خواب ترتیب دینا ہو گا (۲)

اکیسویں صدی کے آغاز سے پہلے دنیا کا منظر نامہ اور تھا۔ ۲۰۰۱ء میں نیو یارک میں امریکی قوت و سطوت کی دو عظیم اور بلند عمارتوں کو منہدم کر کے نوزائیدہ عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کے تانے بانے بُنے گئے۔ انسانی تاریخ کا یہ دور دہشت گردی اور خون سے رقم ہے۔ عالمی تناظر میں اس کے اثرات اور نتائج دوسری عالمی جنگ کے اثرات سے کہیں زیادہ مہلک اور دور رس ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سیاسی و معاشرتی تبدیلیاں بھی تیزی سے وقوع پذیر ہوئیں۔ مستحکم معاشرے عدم استحکام اور ترقی پذیر ممالک مزید ابتری کا شکار ہوئے۔ دہشت گردی، بھوک اور غربت سے جرائم کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں لا اینڈ آرڈر کے مسائل پیدا ہوئے ہیں لیکن اس صورت حال سے نکلنے کے لیے انسانی فکر کے جس ردِ عمل کی ضرورت تھی وہ سامنے نہیں آ سکا۔ موبائل، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے معاشرے کو اس طرح قابو کر لیا

ہے کہ انسان کے پاس غور و فکر کے لیے اب وقت نہیں۔ دانیال طریر (۱۹۸۰ء۔۲۰۱۵ء) نے اپنی کتاب معنی فانی کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> ”جتنا وقت انسانی غور و فکر کے لیے درکار تھا وہ اس سے چھین لیا گیا ہے اور اسے بے معنی تفریحات میں الجھا کر اس کی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ وہ اپنی آواز تک سُننے سے محروم ہو گیا ہے۔ قتل و غارت گری کو اس کے ضمیر پر دستک دینے کی بجائے کھیل تماشے میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اسے رنگوں اور آوازوں کی ایسی پُر کشش دُنیا کا باسی بنا دیا گیا ہے جہاں اس کے تمام ذاتی اوصاف دھندلا گئے ہیں۔ اسے فرصت تک نہیں ملی ہے کہ سوچ سکے کہ وہ اس اندھے سفر پر کب، کیسے اور کیوں روانہ ہو گیا ہے۔ دنیا اس کے لیے گاؤں ضرور بن گئی ہے مگر وہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے اپنی شناخت سے محروم ہو گیا ہے۔“(۳)

اس صورت حال میں کرونا کے بعد مزید شدت پیدا ہو گئی ہے۔ قریباً ایک برس قرنطینہ میں گزارنے کے بعد موبائل اور انٹرنیٹ انسان کی حیثیت پر قابض ہو چکے ہیں۔ ہر فرد اپنی بنائی ہوئی دنیا میں رہنے کا خواہش مند ہے۔ نئی موبائل ایپلیکیشنز نے انسانی زندگی کا رنگ ڈھنگ یک سر بدل دیا ہے۔ پوری دنیا گلوبلائیزیشن کے زیر اثر آ گئی جس کی ایک صورت پوری دنیا کو ایک ثقافتی وحدت میں ڈھال دینا ہے۔

ایسی صورت حال میں جہاں ادب کی باقی اصناف نے ان موضوعات کو اپنایا ہے اردو نظم میں بھی اس استحصالی نظام کے خلاف بھرپور اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر وحید احمد (۱۹۵۹ء) کی نظم ”جگ آشوب“ کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

> ہمارا عہد کیا ہے، درد کی خوانچہ فروشی ہے / زمیں ہے یا کمیں ہے؟ / جنس کے بیوپار کی منڈی ہے / جذبوں کی تجارت کی تماشا گاہ ہے / حرمت کی ارزانی کا اڈہ ہے / گلوبل گاؤں تو نیلام گاہ وضع داری ہے / یہ چپٹا گیند بس اقدار کی سوداگری کا بوجھ اٹھائے گھومتا ہے / کارپردازانِ استہزا / فضا میں ایٹمی مزائلوں کے ساتھ لفظوں کا تمسخر بھی اُڑاتے ہیں / یہاں پر کاروبارِ زندگی اب درحقیقت کاروبارِ زندگی ہے۔(۴)

اس نظم میں وحید احمد جدید دور میں انسان کی بے پناہ ترقی کے پس پردہ، رشتوں اور اقدار کے زوال پر نوحہ کناں اور رنجیدہ ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک اس عروج، نفسا نفسی اور ترقی کی دوڑ میں بھاگتے ہوئے آگے نکل جانے کی خواہش نے انسان کو بے حس بنا دیا ہے یہ بحث تو موضوع کی حد تک ہے لیکن اس

میں استعمال ہونے والے الفاظ و استعارات کو دیکھا جائے تو ان نظموں کی زبان، وسیلہ اظہار اور تخلیق ہونے والے استعارات پرانی نظم سے مختلف نوعیت کے ہیں۔ درد کی خوانچہ فروشی، تجارت کی تماشا گاہ، گلوبل گاؤں، چپٹا گیند، ایٹمی میزائل یہ سب الفاظ اور استعارات معاصر عہد کے دیے گئے ہیں۔ اسی طرح عبدالرشید(۱۹۳۹۔۲۰۱۹ء) کی نظم کی چند سطور دیکھیے:

دنیا غارت ہو کر اور بھی سیکسی لگنے لگتی ہے / پیزا ہو یا پاستہ ہو یا ویل ڈن سٹیک / ان کو کھانا نہیں ہے منہ سے مجامعت کرنا ہے (دنیا غارت ہو کر)"(۵)

موجودہ عہد میں کچھ بھی ناممکن نہیں رہا۔ ہر چیز انسان کے اختیار اور رسائی میں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی زندگی کو آسائشات سے ہم کنار کرنے اور پُر تعیش بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ جو اقدار نافذ کرنے کی خواہش ہوتی ہے اسے میڈیا کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے، مصنوعات بیچنے کے لیے لوگوں کے سامنے خوب صورتی کے معیارات رکھے جاتے ہیں اور پھر موٹے، پتلے، کالے جیسے احساس کم تری میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ معاصر عہد میں فرد کا کھانا، پہننا، رہنا سب کا دکھاوا زندگی کا لازمی جزو بن گیا ہے۔ کپڑوں، جوتوں اور کھانے کے نئے برانڈز نے انسان کا اندر سے لالچی اور حریص بنا دیا ہے۔ خدا کی تخلیق میں ردوبدل کرنا اور ٹیسٹ ٹیوب اور کلوننگ کے عمل سے اپنی پسند کا انسان تک پیدا کر لینا اب انسانی اختیار میں ہے۔

ہر ایک سائٹ پہ پیرا سائٹ / تمام ٹیوبوں پہ ٹیسٹ ٹیوبوں سے زندگی پانے والی / خلقت! / یہ ویب کیموں پہ اپنے اپنے بدن دکھاتے ہوئے عجوبے / یہ سرچ گوگل پہ اپنے افکار ڈھونڈنے والے / علم زادے! / یہ پور کے لمس پر تھرکتی برہنہ دُنیا / کلون چہرے / یہ سرجری بعد حسبِ منشا تمام اعضا / یہ آختہ آتمائیں ساری(۶)

"علم زادے" کا خطاب اس عہد کے انسان کا استعارہ ہے جو ادب اور علم کی تلاش میں کتاب کی بہ جائے فیس بُک پڑھنا اور سرچ گوگل پر اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے میں مشغول ہے۔ علم کے ساتھ یہ اپنی تنہایوں، اداسیوں، اور محرومیوں کو دور کرنے کے لیے بھی سوشل میڈیا کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں تعلقات بنانے اور محبت پھیلانے کی بہ جائے اس کے نزدیک یہ کام بھی سوشل میڈیا اور فیس بک زیادہ بہتر طور پر سرانجام دے سکتے ہیں، سو وہ اسی میں محو ہیں۔ مذاہب پر گفت گو اور فتوے لگانے کے لیے سوشل میڈیا ایک اچھا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے۔ مختلف ادبی فورم بنا کر علمی و ادبی مباحثوں کے ذریعے علم حاصل کرنے میں غرق ہیں۔ بعض شعرا نے اپنی نظموں میں وہ استعارات شامل کیے ہیں جو

ذرائع ابلاغ اور اس حقیقت کے پیش نظر ہیں کہ ہمارا معاشرہ تیزی سے صارفین کا معاشرہ بنتا جارہا ہے اور نئے اسباب حیات سے نہ صرف تعارف حاصل ہو رہا ہے بلکہ وہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ ان تجربوں کو کبھی ترقی اور جدیدیت کے نام پر سراہا اور خوش امدید کہا جاتا ہے اور کبھی ماضی کے کلچر کو ایک متاثر کن پیرائے میں یاد اور پیش کیا جاتا ہے۔

لہذا یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ اکیسویں صدی کے اردو نظم گو شعرا نے مشینی عہد کی نئی شعری فضا کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کو اپنی نظموں میں اجاگر کیا ہے اور بڑی عمدگی سے جدید مہذب اور ترقی یافتہ شہروں کی زندگی، بے پناہ ہجوم، کبھی نہ ختم ہونے والا شور وغل۔ انسانوں کو اندر سے کھوکھلا کرتا ہوا مشینوں کا دھواں، معاشرتی انتشار، بے چینی اور اضطراب اور جدید عہد کے مہذب انسان جو در حقیقت مشینوں کے غلام بن کر رہ گئے ہیں، اُن کی سیاسی سماجی اور معاشرتی زندگی اور اس کے مسائل کی مکمل جزیات کے ساتھ بہترین عکاسی اپنی نظموں میں کی ہے۔ "صارفیانہ کلچر" جہاں اشیا سے لے کر انسان تک سب برائے فروخت ہے۔ عشق، محبت، مامتا جیسے الفاظ اب اپنے معنی تبدیل کر رہے ہیں کیوں کہ انھیں بھی خریدا اور بیچا جاسکتا ہے۔ انوار فطرت اور علی محمد فرشی کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جو ہمارے عہد کے کمرشل ازم کا نوحہ لگتی ہیں۔

ٹیکنالوجی کے حد سے بڑھے ہوئے استعمال نے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا ہے جہاں انسانی اقدار کے معنی بدل چکے ہیں۔ ہر طرف نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی چکاچوند جلوہ گری ہے۔ یہ ایسی دل دل ہے جس میں ایک بار داخل ہونے کے بعد انسان اندر تک دھنستا چلا جاتا ہے۔ اس نے انسانی فکر کے دھارے تبدیل کر دیے ہیں نیز انسان سے وہ سارا وقت چھین لیا ہے جو اس کی تخلیقی زندگی اور غور و فکر کے لیے اسے درکار تھا۔ اس نے انسان کو بے معنی تفریحات میں الجھا کر اسے اپنا سیر کر لیا ہے۔ صرف ایک کلک پر نوجوان نسل کو اپنی عمر سے پہلے بڑا کرتے ہوئے مناظر اپنے اندر کیسی طاقت ور کشش رکھتے ہیں۔ یہ نیٹ ورکنگ کی دُنیا ہے جہاں ہر چیز پبلک کی ہے اور اس کی رسائی میں ہے۔

دنیا انسان کے لیے گاؤں ضرور بن گئی ہے مگر وہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے اپنی شناخت سے محروم ہو گیا ہے۔ ڈبلیو ٹی او اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نیز گلوبلائزیشن وغیرہ نے جس 'صارفیت کلچر' کو فروغ دیا ہے اس نے انسان سے اس کے 'اشرف المخلوقات' ہونے کا شرف چھین لیا ہے۔ شمیم حنفی (۱۹۳۹۔۲۰۲۱ء) ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ”صنعتی تمدن ایک نیا ذہنی استعارہ ہے جس سے انسان کی جذباتی زندگی میں الجھے ہوئے سوالوں کا ایک طویل سلسلہ جڑا ہوا ہے.... مشینوں کی حکومت انسانی طرزِ عمل کی ایک تصویر کشی کرتی ہے جس میں خود انسان کی حیثیت ایک حساس مشین سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ انسانی عظمت کے دوسرے سرچشمے نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔“(۷)

اکیسویں صدی ی پہلی دہائی کی شاعری کا غالب موضوع دہشت گردی اور اس سے متعلقہ موضوعات تھے۔ ذیشان ساحل کے ہاں خاص طور پر اور دیگر تمام شعرا کے ہاں یہ موضوعات اپنے جداگانہ اسلوب کے ساتھ آئے ہیں۔ ایک بڑا فرق زبان اور استعمال ہونے والے استعاروں کا ہے۔ ذیشان ساحل (۱۹۶۱۔۲۰۰۸ء) نے رات، باغ، پرندہ، گیت، ستارہ، آئینہ، درخت اور پھول وغیرہ جیسے استعارات کو برتا۔ خاص طور پر پرندے اور پھول تو ان کے پسندیدہ ترین استعارے ہیں اور اس کے علاوہ ”چڑیا“ کو ان کی نظموں میں خاص اہمیت حاصل ہے جو محبت کے گیت گاتی ہے۔ شام، خواب، درخت اور کشتیوں کا ذکر بھی ان کی نظموں میں کثرت سے ملتا ہے؛ جب کہ بعض شعرا نے تلخ، سخت، اجنبی اور کھردرے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ دوسری دہائی تک دہشت گردی اور جنگی موضوعات تو کسی حد تک کم ہو گئے لیکن تب ایک ایسی خلقت تیار ہو چکی تھی جس نے دنیا کو جنت کم اور جہنم بنانے میں زیاداہ کردا ادا کیا۔ حمیدہ شاہین (۱۹۶۳ء) کی ایک نظم کی کچھ سطور دیکھیے:

> ہر سمت کوڑیالے / زہریلے پھن اٹھائے / لمبی زباں نکالے / لہراتے پھر رہے ہیں / گلیوں میں، آنگنوں میں /راہوں میں محفلوں میں / پھُنکار گونجتی ہے / ہر سو ہیں سرخ آنکھیں / کالی سیاہ دہشت / بے نام سی نحوست / پیروں میں رینگتی ہے / فصلوں میں پھر رہی ہے / پھولوں پھلوں کے رس کو / زہراب کر رہی ہے / یہ زہر آگیں خلقت / اندھے بلوں سے باہر / کیسے اُمڈ رہی ہے / کہیں بین بج رہی ہے؟ (کہیں بین بج رہی ہے)۔(۸)

اب آپ اس خلقت کو پہچانیے۔ زندگی کو بد صورت بنانے والے سیاست دان، بیوروکریٹ، سرمایہ دار، جاگیر دار، ملّا، ملاوٹ کرنے والے دکان دار، رشوت لینے والے اہل کار، گلیوں سڑکوں کو گندہ کرنے والے عوام، اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھانے والے، بم دھماکے کرنے والے، اپنے اور دوسروں کے ملکوں پر قبضہ کرنے والی افواج، تشدد کرنے والی پولیس اور ایجنسیاں، بینک اور دیگر معاشی استحصال کرنے والے مالیاتی ادارے، اسلحہ بیچنے والی قوتیں، تیل و دیگر وسائل پر قبضہ کرنے والی قوتیں۔۔۔

یعنی زندگی کو بدصورت بنانے والی تمام منفی قوتیں اس نظم کے موضوع میں شامل ہیں۔ جن کا بیان کھردرے الفاظ اور منفرد استعاروں میں کیا گیا ہے۔

معاصر عہد میں نئے عالمی نظام کو نافذ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ میڈیا ہے جو ذہن سازی کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہا ہے۔ دکھایا اور سنایا وہ نہیں جاتا جو سچ ہے بل کہ جو مقصود ہوتا ہے اسے سچ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اشتہارات چینلز تفریح کے نام پر رشتوں کے تقدس اور اقدار کو پامال کر رہے ہیں جب کہ نیوز چینلز کا کام خبروں سے زیادہ سنسنی پھیلانا ہے۔ اس حوالے سے دانیال طریر نے ایک نظم "جیو جنگل" میں بھرپور اظہار کیا ہے۔ جس میں شاعر نے موجودہ عہد میں میڈیا اور اس کے کردار کو جنگل کے استعارے میں بیان کیا ہے۔ جنگل، لاقانونیت، افراتفری، خوف اور دہشت کی علامت ہے۔ اس نظم میں بھی جانوروں کی تمثالوں کے ذریعے صورتِ حالات کو واضح کیا گیا ہے:

سارا امبر چیلوں کا ہے / دھرتی سانپوں کی ہے ساری / خوف کی ماری / بھول گئیں منزل کا
رستہ / بھیڑیں ساری / رنگ بدلتے گرگٹ گھومیں / جھومیں ناچیں باری باری / کائیں کائیں
کوّے آئیں / خبریں لائیں(۹)

چیلوں بھرا آسمان اور سانپوں سے بھری زمین دونوں خوف اور دہشت کے استعارے ہیں اور یہ خوف اور دہشت پھیلانے کے لیے اس ملک کے لیے اس ملک کے خبر رساں ادارے پورا ایک نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہ خبریں' خبریں کم اور خوف وہراس پھیلانے والے اعلان زیادہ لگتی ہیں۔

"گرگٹ" منافقت کا استعارہ ہے۔ سیاست دان اپنے مفادات کی خاطر جن سیاسی چال بازیوں سے کام لیتے ہیں اور جس منافقانہ طرزِ عمل کا اظہار کرتے ہیں، اس کے بیان کے لیے شاعر نے گرگٹ کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ یہ استعارہ نیوز پروگرامز کے اینکرز کا بھی ہو سکتا ہے جو بظاہر تو عوام کے سامنے سچ لانے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں لیکن چینل بدلتے ہی وہ سیاسی پارٹیاں بھی بدل لیتے ہیں ۔اپنے چینلز کی ریٹنگ بڑھانے اور مفادات حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ صحافت کے شعبے میں پائے جانے والے منافقانہ طرزِ عمل کو شاعر نے اس نظم میں موضوع بنایا ہے۔ 'کوّا' یہاں کسی 'نیوز رپورٹر' کی علامت ہے۔ نظم کا اگلا حصہ دراصل وہ 'خبریں' ہیں جو رپورٹر دے رہا ہے۔ یہ حصہ استعاراتی بیان میں کوئی خبرنامہ معلوم ہوتا ہے۔ سُپر پاور کا کم زور ممالک پر کسی نہ کسی بہانے سے حملہ، امراء، وزرا کے غیر ملکی دورے، کھیلوں کی خبریں، یعنی سب کو پیچھے چھوڑ جانے کی دوڑ میں وہی جیت رہا ہے جو تیز بھاگنا جانتا

ہے۔ اور سب سے خاص خبر ملک دشمن عناصر سے دوستی کا اعلان اور اسے خوش آئند قرار دینا' جب کہ اس کے پس پردہ حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔ قتل و غارت، لوٹ مار اور جنسی زیادتیوں کی خبروں کو سنسنی پھیلانے والے انداز میں بیان کرنا ایک عجیب سی دہشت ناک فضا پیدا کر دیتا ہے: شمیم حنفی اپنی کتاب خیال کی مسافت میں انتھونی سمتھ کے مضمون "*The Geo-Politics of information how western culture dominates the world*" میں سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

> "اس نئے میڈیا میں مغرب کی کسی بھی پرانی ٹیکنالوجی سے کہیں زیادہ گہرائی تک اتر جانے کی طاقت ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے اندرونی تضادات کو بڑھاوا دے کر اس (نئے میڈیا کی قبولیت) کا انجام انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔"(۱۰)

جدید نظم گو شعرا نے ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ اور الیکٹرانکس سے متعلق الفاظ اتنی سہولت سے اپنی نظموں میں استعمال کیے ہیں کہ اس پر حیرت بھی ہوتی ہے اور نئے انکشافات کی مسرت بھی محسوس ہوتی ہے۔ بہت سی نئی اصطلاحیں معاصر شعرا نے نظموں میں استعمال کی ہیں اور شاعری جو کہ تیغ و تبر، تیر و تفنگ، موجِ خرامِ ناز اور نقشِ کفِ پا کے سے استعاروں کی عادی چلی آ رہی تھی اس سے شاعری کے موضوعاتی آفاق پھیلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کے منشور میں یہ شق شامل کرائی تھی کہ اب ہمیں اپنا تصورِ حسن بھی تبدیل کرنا ہو گا۔ اس تجویز کے بعد کھیتوں اور ملوں میں محنت کرنے والے کسانوں اور سڑک کی تعمیر میں پتھر توڑنے والی محنت کش عورتوں کے حوالے سے تو خاصا کچھ ادب میں شامل ہوا لیکن اب نئی ٹیکنالوجی شاعروں کو جمالیات اور زندگی کے نئے احساس کے جس منظر نامے سے متعارف کرا رہی ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے نئے مظاہر سے جس طرح وابستہ ہوتی جا رہی ہے۔ اُس نے شاعری میں بھی ایک نئی جمالیاتی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ یہ جمالیات گل و بلبل کی روایتی لفظیات سے الگ کوئی چیز ہے جس کی مثال ثروت زہرا (۱۹۷۲ء) کی اس نظم میں بھی ملتی ہے:

> چیٹنگ روم میں، سردیوں کے رش / میں گھٹی سانس / انسانوں کے چہرے پہنے
> جذبے کھائیں روح چبائیں / تنہائی کے روپ رنگیلے رقص دکھائیں / حرفوں کے بجھتے
> انگارے / کتنے دن تک اور چنو گی / پیاس تو مانگے رستہ جل کا / (انٹرنیٹ استھان پہ بیٹھی
> خواب کی ملکہ)(۱۱)

اس مثال سے اس حقیقت کو سمجھنا ممکن ہو گیا ہو گا کہ ہماری نظم میں زبان اور موضوعات ہر دو اعتبار سے تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ استعارات کے حوالے سے دیکھا جائے تو نیند خواب سفر ہجرت موت اور احساس بیگانگی ہماری اردو نظم کے چند مسلسل رویے رہے ہیں اس میں چند اضافے اور نئے عناصر ضرور شامل ہوئے ہیں لیکن یہ امر شاید باعث حیرت ہو کر عہد میں بھی یہی چند استعارے استعمال کرنے کا رجحان سب سے زیادہ ہے خاص طور پر خواب اور نیند کے استعارے تمام شعراء کے ہاں بہ کثرت ملتے ہیں۔

معاصر اردو نظم میں نرم اور کومل استعارات کی نسبت کھردرے اور سخت استعارات و علامات کا استعمال نمایاں نظر اتا ہے۔ روش ندیم کی کتاب ٹشو پیپر پر لکھی نظمیں زاہد امروز کی خود کشی کے موسم میں، سدرہ سحر عمران کی ہم گناہ کا استعارہ ہیں۔ کی نظمیں اس حوالے سے نمائندہ نظمیں ہیں لیکن صرف ان کے ہاں ہی نہیں بل کہ دیگر کئی شعرا کے ہاں بھی یہ رجحان نظر آتا ہے۔

معاصر عہد کے نظم نگاروں کے ہاں جنسی موضوعات بھی ملتے ہیں اور بعض دیگر موضوعات کے بیان کے لیے جنسی استعاروں کے استعمال کا بھی وسیع رجحان ملتا ہے۔ جدید نظم نگاروں کے یہاں سفر، خواب، کشتی، دریا، ریت، دھند اور دھوپ جیسے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بارش، آنسو، رنگ، دعا، آسمان، پرندے، خواب، صحیفے اور سمندر جیسے استعارات اور علامتیں تواتر کے ساتھ اس عہد کی نظموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ موجودہ زندگی کی صحیح اور موزوں تعبیر پیش کرتے ہیں۔ انسان کی پیچیدگیوں میں بھری زندگی کسی طوفان سے کم نہیں ہے جس کو شاعر اس طرح کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔

جدید نظم کے شاعر نے ان استعارات کے ذریعے پورے معاشرے کے بیمار جسموں اور ذہنیت کی عکاسی کرنے کی سعی کی ہے، کیوں کہ غمِ ذات کا تجربہ خواہ کتنا ہی گہرا ہو اسے خارج سے گذر کر ہی ایک استعاراتی نظام وضع کرنا پڑتا ہے اور یوں فرد کا درد ایک شعوری کاوش کے ذریعے دردِ مشترک بن جاتا ہے۔

جدید شاعر ایسی لفظی اور معنوی رعایتیں استعمال کرتا ہے جس سے نظم کی زبان اور فضا دونوں استعاراتی ہو جاتی ہیں۔ اس دور کی نظموں میں فطری زندگی اور صنعتی زندگی کا فرق اور زندگی کے فطرت سے صنعت کی طرف سفر کا پتہ چلتا ہے۔ جدید شعرا کی نظموں میں شور، گڑگڑاہٹ، ریل، فیکٹری، سڑکوں پر بھاگتی مخلوق جیسی فضا ملتی ہے اور اس فضا میں انتہائی افسردہ، کرب زدہ، مایوس، تنہا، بھوکا اور خود سے ناراض

انسان ظاہر ہوتا ہے؛ جب کہ دوسری طرف پہاڑ، جنگل، ندی، جھیل اور جھرنے جیسے الفاظ ہیں۔ یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان میں فضا خوشگوار ہے لیکن یہاں بھی درد ہے، تنہائی اور کرب ہے جس سے نکلنے کی کوشش میں انسان صنعتی زندگی میں مثبت امید کے ساتھ داخل ہوتا ہے لیکن وہ مثبت احساسات سے مزید دور ہوتا جارہا ہے۔

نئی نظم کا منظر نامہ انسانی زندگی اور اس کی ذات کے جن حالات اور مسائل سے تشکیل پاتا ہے وہ انسانی زندگی کے پیچیدہ اور اس کی ذات کے گم ہو جانے سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں احساسِ کرب کی شدت ملتی ہے اور اس عہد کے انسان کی ذہنی کشمکش، اس کی داخلی کیفیت اور اس کی نفسیات کی ترجمانی کرنے کے لیے اور اس کے اندر جھانکنے کی کوشش میں نئے نظم نگاروں نے گنجلک استعاروں سے پرہیز کیا ہے اور پیچیدہ اسلوب اختیار کرنے کی بجائے براہ راست انداز اختیار کیا ہے۔ معاصر عہد کے نظم نگار رمز اور استعارے کا برمحل استعمال جانتے ہیں اور اس بات کا بھی شعور رکھتے ہیں کہ تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں میں اگر دبیز ملفوفیت ہو تو وہ اپنا حسن کھو بیٹھتی ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن (۱۹۶۴) لکھتے ہیں:

> "جدید اردو شاعری میں براہ راست انداز کو اپنایا گیا ہے بظاہر یہ شاعری مکمل طور پر عصری شعور کی عکاسی کرتی ہے لیکن یہ اثر صرف شاعروں کے اثر تک ہی محدود رہتا ہے زمان و مکان پر پھیل کر ہمہ گیری اور آفاقیت حاصل نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ اس شاعری سے ہم اس دور کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں لیکن اس میں اگر ہم شاعرانہ مایوسی کو بھی تلاش کریں تو بجز مایوسی کچھ حاصل نہ ہوگا چونکہ یہ نظم ہنگامی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اس لیے ان میں اسلوب کا کچا پن نظر آتا ہے۔"(۱۲)

لیکن ایسا نہیں کہ اس رائے کی زد میں تمام نظم گو شعرا آتے ہیں۔ ان موضوعات سے ہٹ کر جن شعرا نے بھی فنی تقاضوں کا ملحوظ رکھتے ہوئے نظم کہی ہے وہ بلاشبہ قابل قدر ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سیدہ جعفر، "مراثی انیس میں استعارے کا نظام، مشمولہ: انیس و دبیر، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، (دہلی: ساہتیہ اکیڈمی، ۲۰۰۵ء)، ۱۸۔

(۲) نصیر احمد ناصر، تیسرے قدم کا خمیازہ، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ۵۲۔

(۳) دانیال طریر، معنی فانی، (کوئٹہ: مہردر انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ۲۔

(۴) وحید احمد، نظم نامہ،(لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)،۸۶۔

(۵) عبدالرشید، حبس کا موسم ٹھہر گیا ہے،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)،۹۔

(۶) دانیال طریر، خدا میری نظم کیوں پڑھے گا،(کوئٹہ: مہر در انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز)،۷۸۔

(۷) شمیم حنفی، خیال کی مسافت،(کراچی: شہرزاد پبلیشرز، ۲۰۰۳ء)،۱۱۸۔

(۸) حمیدہ شاہین، زندہ ہوں،(لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۱ء)،۱۲۹۔

(۹) دانیال طریر، معنی فانی،(کوئٹہ: مہر در انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)،۳۸۔

(۱۰) شمیم حنفی، خیال کی مسافت،(کراچی: شہرزاد پبلیشرز، ۲۰۰۳ء)،۱۸۲۔

(۱۱) ثروت زہرا، وقت کی قید،(کراچی: اردو آرٹ انٹرنیشنل، ۲۰۱۳ء)،۳۸۔

(۱۲) ضیاء الحسن، اردو نظم کا ارتقا، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)،۱۰۱۔

BIBLIOGRAPHY

- Abdul Rasheed, *Habs Ka Mosam Thehar Gaya Ha*, (Lahore: Sanjh Publications, 2012).
- Daniyal Tarir, *Khūda Merī Nazam Kiun Parhy Ga*, (Quetta: Meher Dar Institute of Research and Publications).
- Daniyal Tarir, *Ma'ni Fāni*, (Quetta: Mehar Dar Institute of Research and Publications, 2012)
- Hamida Shaheen, *Zinda Hūn*, (Lahore: Multimedia Affairs, 2018).
- Naseer Ahmad Nasir, *Tīsry Qadam Ka Khumyāzah*, (Lahore: Sanjh Publications, 2013)
- Sarwat Zahra, *Waqt Kī Qaid*, (Karachi: Urdu Art International, 2013)
- Shamim Hanafi, *Khyāl Kī Musāfat*, (Karachi: Shahrzad Publishers, 2003).
- Syeda Jafar, Mirasi Anis main Istaary ka Nizam, (Incl.) *Anīs-o Dabīr*, (Ed.) Gopichand Narang, (Delhi: Sahitya Academy, 2005)
- Waheed Ahmad, *Nazm Nāmah*, (Lahore: Al-Hamd Publications, 2012)
- Zia-ul Hasan, *Jadīd Urdū Nazm: Āghāz-o Irtiqa*, (Lahore: Sanjh Publications, 2012)

❖❖❖